پروفیسر ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری
ناردرن یونیورسٹی، نوشہرہ

امّاں سَین: ایک مطالعہ

The paper is in search of a dimension of criticism on pen Sketches written in Urdu. He chooses one of the writers and mentioning the other critics on it, he presented his own version with examples in their preview of proposed critical aspects. His contribution of this field depicts a lot on the author, i.e. Dr. Attash Durrani, whose area of sketch writing is highly admirable.

خاکہ نگاری دراصل کسی فرد کے باطن اور ماحول کی لفظی تصویر کشی ہے۔ جس سے ممدوح اپنی بیشتر خصوصیات کے ساتھ تاثرات و تصورات کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں یہ کام ممتاز مفتی نے نفسیاتی تجزیوں کے حوالے سے انجام دیا اور بس لیکن اس میں اردگرد کے ماحول کی تصویر کشی نہیں ملتی جو فرحت اللہ بیگ کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ممدوح کے ساتھ تعلق اور نسبت جو محمد طفیل نے مختلف احترامات کے ساتھ دی ہے، وہ بھی خال خال ہے۔ امّاں سین اور دیگر شخصیت میں ڈاکٹر عطش دُرّانی ان تمام جہتوں سے واضح تصویریں بناتے ہیں بلکہ ثقافت، تہذیب اور گزرتے لمحات کے المیے کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے خاکے جامع قرار پاتے ہیں اور یوں شخصیہ نگاری کی تعریف وضع کرتے ہیں۔

ویسے بھی اُردو خاکہ نگاری پر مختلف قسم کے تحقیقی مقالے لکھے جانے کے بعد جو محض معلومات مہیا کرتے ہیں یا کتابیاتی علم سامنے لاتے ہیں، کوئی ایسی جامع تحقیقی کتاب ابھی تک سامنے نہیں آتی جو کسی ایک ممدوح کی شخصیہ نگاری پر مختلف ادیبوں کی قلم طرازی کا تجزیہ اور امتزاج پیش کر سکے۔ مثلاً احسان دانش پر کوئی دسیوں خاکے لکھے گئے۔ تحقیق کار کا کام یہ ہے کہ ان سبھی خاکوں کو ملا کر دیکھے کہ کون کس حد تک احسان دانش کی شخصیت کے ظاہر و باطن کی تصویر کشی میں کامیاب ہوا

اور مجموعی طور پر یہ کیسی تصویر بنتی ہے۔اکثر مقالہ نگاروں نے احسان دانش پر چند صفحات کے مضمون کو بھی خاکوں میں شامل کیا ہے جو ''تصویر کشی'' یا ''سکیچ'' کی تعریف پر پُورا نہیں اتر سکتا۔خاکوں کو اس لحاظ سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ڈاکٹر صاحب کی خاکہ نگاری پر یوں تو کئی نگاشات سامنے آئیں۔(۱) عطش نامہ میں میرے قلم سے ان سب کا جو احاطہ کیا گیا، کچھ حسبِ ذیل تھا:۔(۲)

آپ کے نثری اُسلوب کا ایک پہلو آپ کی عمومی اور تحقیقی و تنقیدی تحریروں میں نظر آتا ہے جسے ایک لفظ ''قطعیت(Clarity)''سے یاد کیا جا سکتا ہے۔آپ بات بہت نپے تُلے الفاظ میں کرتے ہیں۔مزید برآں وضاحت، زور بیان اور بعض مواقع پر جوش ،وُفُوراور گھن گرج ذیلی خصوصیات ہیں۔سنجیدہ یا علمی تحریروں میں آپ زیادہ تر طویل جملوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔لیکن معانی اور مفہوم بیان کرنے کے تسلسل کے ساتھ جس میں بیکارالفاظ شامل نہیں ہوتے اور بات میں تکرار بھی پیدا نہیں ہوتی۔اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لیے آپ اصطلاحوں کا رواں استعمال بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نئی الفاظ سازی کو بھی اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔نثر نگاری کا ایک سب سے بڑا نقص یا عیب اس کا مصنوعی پن یا بے وجہ کی تزئین و آرایش یعنی لفّاظی ہے۔آپ اس طرف قطعاً توجہ نہیں دیتے۔انتخابِ لفظی یقیناً آپ کے بھی پیش نظر رہتا ہے لیکن اپنی تحریروں کے لیے آپ صرف انھی الفاظ و اصطلاحات کا انتخاب کرتے ہیں جن سے مفہوم کا ابلاغ مکمل ہو سکے۔اس لیے ابلاغی پہلو سے ہم آپ کواُردو میں اعلیٰ سطح کا نثر نگار کہہ سکتے ہیں۔بقول حمید قیصر :

'' میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُردو زبان کا لسانی مستقبل سنوارتے سنوارتے ڈاکٹر عطش دُرّانی کی شخصیت بحیثیت ایک ادیب بالکل چھپ کر رہ گئی ہے۔وہ ایک اعلی پائے کے انشا پرداز اور نثر نگار ہیں۔میں حوالے کے لیے ان کے خاکوں کی ایک کتاب اَمّاں سَینپیش کرتا ہوں۔اَمّاں سَین میں انھوں نے اپنی پھوپھی اَمّاں ،ابا جان اور دیگر اہم علمی ادبی شخصیات پر خوبصورت اور بھرپور ادبی پیرائے میں خاکے تحریر کر کے انھیں زندہ جاوید کر دیا ہے۔میرے نزدیک وہ پہلے ایک ادیب ہیں اور بعد میں ماہر لسانیات و انشا پرداز۔''

نثری تخلیقی میدان میں آپ نے خاکہ نگاری ،مصاحبات اور کہانی کی صنف کو اپنایا اور اس میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل کی۔اُردو ادب کے سنجیدہ قارئین نے ان تحریروں کی اثر آفرینی کو

محسوس کیا اوربالاتفاق قرار دیا کہ ایسے عمدہ خاکے آج تک اُردو ادب میں نہیں لکھے گئے۔ آپ انھیں خاکہ نہیں ، شخصیہ (Portraiture) کہتے ہیں کیونکہ آپ کے نزدیک یہ شخصیت کا احاطہ کرتے ہیں۔ پہلے خاکے میں تقدس کا ماحول تھا۔ دوسرے میں علمی ماحول ہے۔ تیسرے میں رومانوی ماحول ہے۔ انھیں اُسلوب کے لحاظ سے افسانہ اور مزاج کے لحاظ سے خاکہ قراردیا جاتا ہے۔اَلّاں سَین جہاں ایک خاتون کی شخصیت کا خاکہ ہے، وہاں آپ کے اندازِ فکر و نظر کا آئینہ بھی ہے۔ یہ آپ کے محسوسات اور زاویۂ نظر کا پر تو بھی ہے۔ سارے خاکے میں آپ کا باطن جھلکتا ہے۔اسی طرح خاکے حضرت انسان میں ایک شخص کی کہانی نہیں پورے معاشرے کی تصویر کشی ہے۔ایک مخصوص فلسفۂ حیات ہے جو آپ سے ماخوذ ہے۔ جُوجی جان بنیادی انسانی احساسات کی تصویر کشی ہے۔ جسے ۲۰۰۹ ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے سال کے بہترین ادب میں شمار کیا گیا ہے۔ منظر نگاری سے فکری مقامات ، فلسفۂ ذات و کائنات اور کئی دیگر پہلوئوں تک ایسے ہیں، جو ان خاکوں میں جا بجاملتے ہیں۔ان کے پنجابی، سرائیکی اور سندھی تراجم بھی سامنے آچکے ہیں۔بقول حمید قیصر :

''ڈاکٹر عطش دُرّانی کا قلم''اَلّاں سَین ''کے خاکے لکھتے ہوئے بڑی روانی سے چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ان خاکوں میں عطش دُرّانی کی صورت ایک مشاق ادیب اپنی تمام تر تخلیقی جوہر بندی سمیت ہمارے سامنے آتا ہے۔ان خاکوں کو پڑھتے ہوئے لفظوں میں جاگتے جذبات و احساسات سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ سینت سینت کے لکھی تحریروں کا یہی تخلیقی تحقیقی حسن ہوا کرتا ہے جو انھیں سدابہار اور کرداروں کو لافانی بنا دیتا ہے۔''

اَلّاں سَین کے نام سے یہ کتاب پہلے ایڈیشن میں تو صرف اسی ایک شخصیے پر مشتمل تھی، پھر جوں جوں ایڈیشن شائع ہوتے گئے، مشمولات کی تعداد بڑھتی گئی۔ حضرتِ انسان بھی الگ طور سے شائع ہوا۔ پھر ایک ایڈیشن میں دونوں خاکے یک جا ہو گئے۔ پھر جُو جی جان تخلیق ہوا اور کتاب کا نام اَلّاں سَین اور دیگر شخصیے میں بدل گیا۔ اگلے ایڈیشن میں اِک عظیم انسان اور اُردو کالمنگ شامل ہوئے۔ بات یہیں نہیں رُکی۔اِک عظیم انسان بہت عرصہ پہلے کی ایک تحریر تھی۔ایسی ہی دو اور تحریریں بارِ عظمت اور ساربان ملا کر ایک اور ایڈیشن وجود میں آیا۔اس کے چوتھے ایڈیشن (۲۰۱۵ء) میں مزدورِ دانش اور بصیرتِ عظمٰی کا نقیب کے نئے خاکے شامل ہوئے۔ گویہ سب پہلے تین خاکوں کی سطح کے تو نہیں تھے،

مگر خاکہ نگاری کی تعریف پر پورے اُترتے ہیں۔اس لیے ان کی شمولیت کا جواز موجود ہے۔

خاکہ نگاری یا شخصیت نگاری میں ممدوح کے ظاہری سراپا اور باطنی شخصیت ہر دو پہلوئوں کا مطالعہ اہمیت رکھتا ہے۔اس حوالے سے آپ نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ انتہائی منفرد اور قابل تقلید ہے۔شخصیات کے معمولات کے بارے میں کئی خاکہ نگار اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں لیکن خاکہ نگاری کے سراپا نگاری اور داخلی کیفیات وہاں شخصیت نگاری میں فرحت اللہ بیگ اور خاکہ نگاری میں ممتاز مفتی کے بعد آپ بہترین قلمی تصویر کشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پربقول مسرت زاہدی آپ کی خاکہ یا شخصیہ نگاری کو ہم زورِ بیان اور گداز، وفُور، جزئیات نگاری، تہ در تہ کردار نگاری، ثقافت نگاری، تجسیم ، علامت اور استعارہ کا استعمال، اختصار، کفایتِ لفظی اور عمدہ انتخابِ لفظی، تصویریت، جاندار منظر کشی، اعلیٰ خیال افروزی، جدتِ ادا، حسن ادا اور سادہ مگر پُرکار اُسلوب سے مملو تحریریں قرار دے سکتے ہیں جو اِن بلند پایہ فن پاروں کے انداز میں آج تک اتنی جامعیت کے ساتھ اُردو ادب میں نہیں ملتی۔سید عابد علی عابد سے لے کر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک نے عمدہ اُسلوب کے کل یہی عناصر گنوائے ہیں جو تمام کے تمام ان خاکوں میں موجود ہیں۔ان خاکوں میں نئے الفاظ و تراکیب اور معروف لفظیات کا نئے انداز و مفہوم میں استعمال ہواہے۔ مقامی الفاظ کی خوبصورت بُنت، بالواسطہ اندازِ بیان، شعریت اور افسانویت ان تحریروں کی دیگر خصوصیات ہیں۔ان سب سے بڑھ کر ایک کُلی شعورِ ذات و کائنات اور ادراکِ وجود و انفرادیت جابجا نظر آتا ہے۔ آپ کی کہانیوں میں ہمّت، حوصلے اور جدوجہد ہی کومرکزی حیثیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری کے نزدیک اُردو ادب میں بہت ساری کتابیں اُسلوب کے حوالے سے مقبول و معروف ہوتی ہیں، ابوالکلام آزاد کی غبار خاطر ہو یا مختار مسعود کی کتاب آواز دوست، دونوں میں اُسلوب ہی غالب نظر آتاہے۔اس شخصیے کو پڑھ کر اس فہرست میں عطش دُرّانی کا نام بھی لکھنا پڑے گا۔ایسے خوبصورت استعارے استعمال کیے گئے ہیں جو ہمیں اُردوادب کی پوری تاریخ میں نہیں ملتے۔استعاراتی تحریر میں روانی اور فکری بلند خیالی کو نبھانا بہت ہی مشکل کام ہے۔آپ نے کمال مہارت سے اس شخصیہ کو افسانوی طرز میں حقیقت نگاری کا ایسا نمونہ بنا دیا ہے کہ اس کی تقلید نا ممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔

خالد محمود کے بقول :

”ڈاکٹر عطش دُرّانی کے ہاں خاکوں کے لیے شخصیات کا انتخاب اُردو کے معروف خاکہ نگاروں فرحت اللہ بیگ، پرو فیسر رشید احمد صدیقی ، مولوی عبد الحق، سعادت حسن منٹو، شاہد احمد دہلوی، حمیدہ اختر حسین رائے پوری سے مشابہ ہے ، جو اپنے خاکوں میں شخصیات کا انتخاب تعلقِ دیرینہ کی بنا پر کرتے ہیں۔ڈاکٹر عطش دُرّانی کے خاکوں میں اُسلوب بہت دلکش ہے۔ان کا اُسلوب بیانیہ اور افسانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔خاکے کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ساتھ ساتھ ایک کہانی چلتی محسوس ہوتی ہے۔حالات و واقعات کی بُنت میں افسانوی ورومانوی رنگ غالب ہے۔الفاظ کا انتخاب بہت اچھا ہے۔الفاظ علامت اور تازگی کا بیش قیمت نمونہ نظر آتے ہیں۔ایک کردار سے دوسرے کردار کی جانب سفر بہت دلکش ہے۔ڈاکٹر عطش دُرّانی خاکہ نگاری کے میدان میں معروف خاکہ نگاروں کی روایت کے امین نظر آتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ خاکوں میں شاعرانہ نثر، جزئیات نگاری ، فلسفہ حیات ، سوانح حیات کے بیان میں انھیں خصوصی امتیاز حاصل ہے۔

آپ کے ہم جماعت قیوم راناکی رائے ہے کہ ان خاکوں میں عطش دُرّانی نے فلسفے کے گنجلک پہلوؤں کوسادہ اُسلوب میں صفحہ قرطاس کی زینت بنایا اور ڈاکٹر محسنہ نقوی کے نزدیک ڈاکٹر عطش دُرّانی کے خاکوں میں باکمال فنکار جھلکتا ہے''۔

جناب شاہد حنائی نے اپنی کتاب اُردو خاکہ نگاری: فن، تاریخ، تجزیہ (۲۰۱۵ء) میں خاکہ نگاری پر مباحث، کتابیات اور دیگر حوالوں سے بہت عمدہ مجموعہ پیش کیا ہے۔اس میں آپ کی کتاب امّاں سین اور دیگر شخصیے کا تذکرہ بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد عباس نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے پندرہ سالہ خاکہ نگاری: مجموعی رجحانات (۱۹۹۱ء تا ۲۰۱۵ء) میں، جناب مبین مرزا نے اُردو کے بہترین شخصی خاکے (۲۰۱۵ء) ، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم نے اپنے مضمون خاکہ نگاری (۲۰۱۵ء) ، افتخار شفیع اور ڈاکٹر اشفاق بخاری نے۲۰۱۵ء میں امّاں سَین جیسے مجموعے کو جو رائے دی ہے، وہ اپنی جگہ بجا مگر ابھی اس کتاب کے استحسان کا بنیادی پہلو مزید توجہ کا تقاضا کرتا ہے۔

خاکہ نگاری دراصل کسی فرد کے باطن اور ماحول کی لفظی تصویر کشی ہے۔جس سے ممدوح

اپنی بیشتر خصوصیات کے ساتھ تاثرات و تصورات کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں یہ کام ممتاز مفتی نے نفسیاتی تجزیوں کے حوالے سے انجام دیا اور بس، لیکن اس میں اردگرد کے ماحول کی تصویر کشی نہیں ملتی جو فرحت اللہ بیگ کے ہاں پائی جاتی ہے۔ممدوح کے ساتھ تعلق اور نسبت جو محمد طفیل نے مختلف احترامات کے ساتھ دی ہے، وہ بھی خال خال ہے۔ڈاکٹر محمد عباس نے کہا ہے کہ یہ خاکہ نگاری کے اُصولوں پر پُورے نہیں اُترتے کیونکہ ان میں صرف مدح سرائی کی گئی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میٹھے خربوزے اور اچھی پھوپھو قسمت سے ملتی ہے، سو آپ خوش نصیب رہے۔دوسرے یہ کہ آپ کے اُسلوب میں عیوب کو ڈھانپتے ہوئے اندازِ دگر اختیار کیا گیا ہے۔وگرنہ ہر خاکے میں ممدوح کے منفی پہلو بھی بڑے واضح نظر آتے ہیں۔بات دقت نظری کی ہے۔اس لیے ڈاکٹر محمد عباس کی رائے کو ہم سرسری کہنے پر مجبور ہیں۔امّاں سَین اور دیگر شخصیہ میں آپ ان تمام جہتوں سے واضح تصویریں بناتے ہیں بلکہ ثقافت، تہذیب اور گزرتے لمحات کے المیے کو بھی سامنے لاتے ہیں۔اس لحاظ سے ان کے خاکے جامع قرار پاتے ہیں اور یوں شخصیہ نگاری کی تعریف وضع کرتے ہیں۔۱۶/مارچ ۲۰۱۶ء کو ر سائی ٹی وی چینل پر انٹرویو دیتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ انگریز ی میں صرف ایک صنف Portraiture ملتی ہے۔اُردو میں اسے شخصیہ نگاری کہیں گے۔

الفاظ کا انتخاب ہی آپ کا اُسلوب ہے۔یہ رومانوی رنگ لیے ہوئے ہے۔ایسا محسو س ہوتا ہے، جیسے افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ظاہری سراپا اور باطنی شخصیت ہر دو پہلوئوں میں یہ انتخاب ہی ان کی اُسلوبیاتی تکنیک ہے۔

ستارۂ امتیازکا اِعزازملنے کے بعد اکادمی ادبیات پاکستان کے رائٹرز کیفے کے زیرِ اہتمام ”اہلِ قلم سے ملیے(Meet the Writer) “پروگرام کے تحت ۷/۱پریل ۲۰۱۶ء کومنعقدہ ایک شام میں آپ نے کہاکہ اُردو میں شخصیہ نگاری(Portraiture) کا کام امّاں سَین سے شرو ع ہوتا ہے، ڈ پٹی نذیر احمد کی کہانی ایک نیم شخصیہ ہے۔ادیبوں، دانشوروں نے آپ کی فنی زندگی اور شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی۔آپ کے زندگی بھرکے کام کوبیحد سر ا ہا گیا۔تقریب میں اعجاز رحیم، مسعود مفتی، حمیداللہ ہاشمی، پرتو روہیلہ مرحوم، محمد حمید شاہد، خالد اقبال یاسر، حمید قیصر، مظہر مسعود، ڈاکٹر محسنہ نقوی، نایاب شاہ، ڈاکٹرسید اشفاق حسین بخاری، حمیرا صادق، ڈاکٹروسیم انجم، صفدر رشید ، سرفراز طارق اور دیگر نے

شرکت کی۔

آپ خاکہ نگاری میں تو نام کما گئے، مگر امّاں سَین کو جو مقام حاصل ہوا، وہآپ کی کسی اور نگارش کو نہیں مل سکا۔ ہر بڑے ادیب کی طرح یہ ان کا شاہکار شخصیہ (خاکہ) ہے، جو قاری کو مسحور اور باطن میں تصویر کشی کرنے پر مجبور کیے بغیر نہیں رہتا۔ جیسے پطرس بخاری کے بارے میں افتخار عارف کہا کرتے تھے کہ اُردو میں بڑے بڑے مزاح نگار پیدا ہوئے مگر پطرس کی ایک مختصر سی کتاب مزاح نگاری کی دُم پر آ بیٹھی ہے۔ اسی طرح ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اُردو خاکہ نگاری میں بھی بڑے بڑے نام ملتے ہیں، ممدوح کی باطنی تصویر کشی کرنے میں یہ ید طولیٰ رکھتے ہیں لیکن اماں سَین ان سب سے بہت آگے خاکہ نگاری کے آسمان پر جا ٹکی ہے۔ کوئی پہنچ کر تو دکھائے۔ اسی باعث آپ کواُردو ادب میں دو بار قومی اعزازات سے نوازا گیا۔

اماّں سین کے سراپا /ظاہری شخصیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: (۳)

"بات یہ نہیں تھی کہ امّاں سَین کے پاس کوئی خزانے کی صندوقچی تھی۔ اخراجات کے سلسلے میں ان کے ہاتھ ہمیشہ بندھے رہے۔ جب خود ضرورت پڑی تو میں نے انھیں ہمیشہ تنگ دست ہی دیکھا۔ ایسے موقعوں پر وہ بی بی کنیز کی طرف ایسے دیکھتیں جیسے بوہڑ کو آندھی نے آن لیا ہو۔ سب سے بڑی بات کہ کنیز مائی روشن کی بہو تھی۔ بوہڑ چھوٹی ڈیوڑھی اور بڑی ڈیوڑھی کے بیچ میں گھرا ہوا تھا۔ پابہ گِل تھا۔ اپنی سر بلندیوں پر جھوم لیا کرتا مگر فطرت کے آگے مجبور تھا۔ مٹی نے اسے جکڑ رکھا تھا، ذراجنبش نہ کر سکتا تھا۔ امّاں سَین بی بی کنیز کے جواب پر اثبات میں سر ہلا کر رہ جاتیں اور بس۔ بی بی کنیز کے بعد امیر و قاضیانی کے ہاتھ میں یہ صندوقچی آئی تب بھی حال یہی رہا۔ اپنے لیے اس میں سے کبھی کچھ نہ نکلا۔

میں نے بوہڑ سے زیادہ توانا ، چھتنار اور خوبصورت درخت نہیں دیکھا۔ طوفانوں کی شدتوں کا مقابلہ کرتا ہے، دھوپ کی تلخیوں کا مزہ چکھتا ہے، موسموں کی تبدیلی سے بے اثر رہتا ہے۔ اس کے پتّے سدا بہار اور سایہ ہمیشہ گھنا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یونانی اسے ملکوتی اور پُر اسرار شجرِ حیات کہتے تھے۔ ایک بار سکندرِ اعظم کی پوری فوج نے سخت دھوپ اور گرمی میں اسی درخت کے سائے تلے وقت گزارا تھا۔ اس نے سبھی کو اپنی عافیت میں لے لیا تھا۔ طوفان بوہڑ کے ڈال توڑ پھینکتا ہے، پھر بھی

اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ میدانوں کا درخت ہے... بلندیوں پر صنوبر کو بزرگ سمجھا جاتا ہے۔ صنوبر کا درخت بھی کچھ ایسا ہی بڑا ہوتا ہے مگر بد شکل ، بدوضع اور مرض خوردہ ہوکر گر جانے والا۔ پتھروں میں جڑیں پھنسائے ہوئے... کرسمس ٹری... پتّی نہ کونپلیں، بس سوئیاں ہی سوئیاں۔ پھل رکھنے کا نہ کھانے کا ... مٹی کی جکڑ بندی بوہڑ کو گراں تو گزرتی ہے لیکن گرنے نہیں دیتی۔ اس کی جڑیں مٹی کے اندر ہی اندر پانی کے ذخیروں تک پہنچ جاتی ہیں۔ پھر یہ پانی ڈال ڈال پات پات اس سلیقے سے تقسیم ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کی مثال میں نے صرف امّاں سَین کے حسنِ انتظام میں دیکھی۔ ہر فرد کا خیال ، ہر شخص کی دیکھ بھال ، مرد ہو یا عورت سب کی ذمہ دار۔

بابا سائیں رخصت ہو گئے لیکن بوہڑ قائم رہا۔ ارادت مندوں کو تقویت حاصل رہی۔ بوہڑ گھر کے اندر اور باہر اپنے وجود کا یقین دلاتا تھا۔ دونوں بیٹے بھی یوں لگتے جیسے اسی سے چمٹے ہوں۔ امّاں سَین کے بعد بھی ایک جان رہے۔ انکی زندگی میں کار بھی ایک تھی، گھر بھی ایک، پھر کاریں تو ضرورت کے مطابق بڑھ گئیں۔ لاہور والے گھر میں دیوار بھی کھنچی، پر قادر بخش والے گھر میں بوہڑ والا صحن تو وہی تھا۔ دیوار کدھر سے کھنچتی؟ پھر بوہڑ کس کے حصے میں جاتا؟

امّاں سَین عمر کی چوٹی سے اتر رہی تھیں۔ جسم فربہ ہو رہا تھا اور زندگی کے معاملات بڑھتے جا رہے تھے۔ چھوٹی سی دیگچی تو دیگوں میں بدل چکی تھی، مہمانوں اور درویشوں کے لیے بستر بھی چار سے چار ہزار ہو گئے تھے۔ چھ ایکڑ زمین تو لنگر، مجلس خانے اور درویشی محلے کی بنیادوں میں چلی گئی۔ فتوحات کی عملیات سے البتہ کئی مربعے زیر کاشت آ چکے تھے۔ فصلیں پک، کٹ کر آتیں۔ گندم، چاول تو باہر جمن شاہ کے پاس ذخیرہ ہو جاتے، سبزیاں، آلو، پیاز، مرچیں، گڑ، شکر، دودھ، مکھن، لسّی، سُوت، کپڑے گھر کی ذمہ داری تھے۔ لمبی لمبی صفوں اور کھیسوں، دریوں پر جوار، باجرہ، مکئی، مرچیں، شکر، دیسی چینی کو دھوپ تاپتے ہم نے بارہا دیکھا تھا۔ انھیں سنبھالنا اور ذخیرہ کرنا امّاں سَین نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ سردیوں میں عورتیں کپاس چن کر لاتیں، بیلنوں پر ان کے بنولے نکالے جاتے۔ روئی دھنوانے کے بعد چرخوں پر سُوت کاتا جاتا۔ تیلیاں کانے تانے بانے کے کام آتے۔ پھر انھیں چڑھوئے کے پاس کھیس، چادریں، دوہریں اور دریاں بُننے کے لیے بھیج دیا جاتا۔ ان دنوں بوہڑ کے ارد گرد کارخانہ سالگ جاتا۔ امّاں سَین کی نگرانی میں یہ سارا کام ہوتا۔ بوہڑ سایہ مہیا کرتا، دوپہر کو چار پائیوں کے

ارد گرد سوت ہی سوت پھیل جاتا۔ کھیس بن کر آتے تو انھیں لکڑی کے کمروں میں تہ کر کے رکھا جاتا۔ سردیاں شروع ہوتے ہی رنگین برآمدوں میں کپڑے کے تھیلے سے بکھر جاتے، جن میں روئی بھر کر نگند نے کا کام ہوتا اور ہر قسم کی رضائیاں بننے لگتیں۔سال خوردہ بوہڑ نے ایسے کئی موسم گزارے۔

ان کے باطنی پہلو / شخصیت کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں: (۴)

" امّاں پُھپّھو کو اپنے سَین ہونے کا تو شاید احساس بھی نہ تھا۔اپنے وجود کا کسی کو یقین تک نہ دلایا۔ وہ تو یہ سب کچھ اپنے شوہر کے حکم پر کررہی تھیں اور بس۔ جس روز ان سے شادی ہوئی، اسی روزانھیں مرشد مان لیا۔ارادت مند بن گئیں، مرید ہوئیں اور پھر زندگی بھر ان کی بیوی ہونے کا زَعم نہ کیا۔ ارادت مندوں نے انھیں سَین کا رتبہ دے دیا مگر وہ تو بس مرشد کا حکم دل وجاں سے بجالاتیں۔ جب پیر عبداللہ شاہ کے مراقبے اور عبادتیں بڑھ گئیں تو خود ماڑی سے نیچے کی منزل سنبھال لی۔ حکم ہوا "تمھارے دو بیٹے ہوں گے"۔ تسلیم کیا کہ وہ پیرزادے ہوں گے، سیدزادے ہوں گے، آلِ رسولؐ ہوں گے۔ بڑے بیٹے کی پہلے روز سے تعظیم کی۔ کبھی اس کی طرف پیٹھ کرکے نہ سوئیں۔ دوسرا بیٹا ظفر شاہ پیدا ہوا تو دونوں ماں کے دائیں بائیں سوتے۔ یہ ارادت مند ماں اس خیال سے تمام رات کروٹ تک نہ لیتیں کہ پشت کدھر کریں۔ دونوں طرف پیرزادے ہیں ، آلِ رسولؐ ہیں، بے ادبی ہوتی ہے۔"رسولُ ہُو، رسولُ ہُو"۔

جب بڑابیٹا سجادہ نشین ہوا تو سب سے پہلے بڑھ کر بیعت کی۔ پیر نواز شاہ آتے تو دور سے انھیں دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوتیں۔اپنے ماں ہونے کا رُتبہ بھی ہیچ تھا۔اب تو وہ پیرزادہ نہیں تھا، پیرومرشد بن کر سامنے کھڑا تھا۔ آگے بڑھ کر جھکتیں، ان کے ہاتھ چومتیں اور اس وقت تک نہ بیٹھتیں جب تک وہ بیٹھ نہ جاتے۔ ارادت کی انتہا تھی، فنافی الشیخ کی منزل تھی۔ بقا کا دعوی نہ تھا۔ عبدُہُو کی گنجایش نہ تھی، "اللہ ہُو، اللہ ہُو۔۔۔تُوہی تُو۔۔۔"

مزاج میں کوئی بل تھانہ فریب۔ جیسے گاؤں سے آئی تھیں، ویسے ہی گاؤں کی ہو رہیں۔ بیٹوں نے لاہور میں کوٹھی تعمیر کرلی، ان کا زیادہ تر وقت شہر کی روشنیوں میں گزرتا لیکن یہ لنگر کی نگرانی جاری رکھتیں۔ سادہ زندگی، سادہ طریقے سے گزارتیں جو سادہ سا برقعہ باپ کے گھر سے پہن کر آئی تھیں، زندگی بھر وہی اوڑھے رکھا۔ نہ گھومنے کی خواہش ، نہ دنیا دیکھنے کا جذبہ۔ دنیا تو خود چل کر انھیں

دیکھنے آتی تھی۔"

اپنے والد کی ظاہری شخصیت اور سراپا کو حضرت انسان میں یوں پیش کرتے ہیں۔(۵)

" اَبّا جی معشوق صفت تو تھے ہی، اب زندگی اور بھی رنگین نظر آنے لگی۔ سہگل کے گانے گراموفون پر سنتے ، کوڈک سے تصویریں بناتے، دونالی سے سیر وشکار کرتے، عطر پُھلیل لگاتے، غرض اس شہزادے کے لیے ہر طرف چین ہی چین لکھا تھا۔

بال انگریزی طرز پر سیدھے اور گھنگھر یالے رکھتے تھے۔ انگریز شکاریوں اور مہم جوئوں کا ساچہرہ مہرہ پسند تھا۔گھنٹوں نوک پلک سنوارتے رہتے ، ناک ستواں اور کان بڑے لیکن کنپٹیوں کے ساتھ جڑے ہوئے۔ پلکیں نہ ہونے کے برابر۔ بھنویں باریک تراش رکھی تھیں۔چہرہ چٹ صفا تھا۔ جب سفید ریش دراز کرلی تو اسے بھی آر ایشِ جمال کا حصہ بنا لیا۔

خوش لباسی اور خود آرائی اَبّا جی کے اعلیٰ ذوق کی آئینہ دار تھی۔ہر قسم کا لباس ان کے جسم پر خوب سجتا۔کوٹ پتلون، دھوتی کرتا، شلوار قمیص، شیروانی عبا، میں نے انھیں ہر لباس میں دیکھا تھا۔ وہ ہر رنگ میں چمکتے تھے۔ اچھے سے اچھا عطر انھیں ہمیشہ مرغوب رہا۔تحفے میں بھی خوشبو پسند کرتے تھے۔صاف ستھرے رہتے۔اُن کے پسینے سے بھی بُو کا ہمیں کوئی تجربہ نہ تھا۔دانتوں پہ بُرش کاری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔موتیوں کی اس لڑی نے بھی عمر بھر ان کے ساتھ وفا کی۔مسکراتے تو لبوں سے زیادہ دانت کِھل اٹھتے۔بال انگریزی طرز پر سیدھے اور گھنگھر یالے رکھتے تھے۔انگریز شکاریوں اور مہم جوئوں کا ساچہرہ مُہرہ پسند تھا۔گھنٹوں بیٹھے نوک پلک سنوارتے رہتے۔ناک ستواں اور کان بڑے لیکن کنپٹیوں کے ساتھ جڑے ہوئے۔پلکیں نہ ہونے کے برابر۔ بھنویں باریک تراش رکھی تھیں۔ چہرہ چٹ صفا تھا۔ جب سفید ریش دراز کر لی تو اسے بھی آرایشِ جمال کا حصہ بنالیا۔ان کے حسنِ تاب دار اور جسمِ اقدس کے رنگ و بُو ابھی تک میرے مُشامِ جاں کو تازہ رکھے ہوئے ہیں۔

یہ ابّا جی کا رعب داب تھا یاشفقت کی چاشنی یا پھر ان کی بھرپور مردانہ وجاہت کہ نہ چاہنے والے لوگ بھی احترام کرنے پر مجبور تھے۔ان کے ساتھ بات کرنے سے پہلے ہمت مجتمع کرنا پڑتی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا تو کسی طور ممکن نہ تھا۔امارت نہ عہدہ، خدّام نہ حشّام۔ پھر یہ کیا بات تھی کہ جو بھی ان سے مل لیتا، انھیں خان صاحب تسلیم کر لیتا، لالہ جی کہہ کر پکارتا۔دوستوں میں عموماً بے

تکلفی ہوتی ہے۔ماسٹر نور احمد کے ہونٹوں پر بھی میں نے ''خان جی'' کا لہجہ ہی دیکھا۔ذوالفقار گونی کی دوکان پر ابّاجی اکثر جا بیٹھتے۔ارد گرد لوگوں کاہجوم ہو جاتا۔خوب باتیں ہوتیں لیکن ادب کے دائرے میں۔خود بھی حیادار تھے اور دوسروں کو بھی ایک فاصلے پر رکھتے۔

ان کی داخلی شخصیت کو یوں بیان کرتے ہیں:[۶]

مجاہد صرف کسی غزوہ میں سرفروشی کرنے والے کانام نہیں۔سامانِ جہاد فراہم کرنے اور حفاظت کے لیے پیچھے رہ جانے والے کو بھی مرتبے اور مقامات کی بشارت ملتی ہے۔ابّا جی کی کسرت، ورزش، نسیم حجازی کے ناولوں میں ان کی دلچسپی، خالد، قاسم اور ٹیپو جیسے ناموں سے ان کی عقیدت ، کشمیر کی آزادی کا ذکر، یہ سب کچھ ایسی ہی کسی ہمت کا اظہار کرتے تھے۔یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء کا معرکہ وجود میں آ گیا۔ابّا جی کے اندر چھپا ہوا مجاہد نکل کھڑا ہوا۔وہ قومی رضا کار بن گئے۔یہاں میں بھی ساتھ تھا۔اس گروہ میں سب سے بڑے ابّا جی اور سب سے کم عمر میں تھا۔سلامی پریڈ کے بعد ابّاجی نے محاذ پر جانے کی باقاعدہ درخواست کی۔اس روز انھیں بہت دکھ ہوا جب ہمسایہ یاسین فوج میں ٹینک چلانے کی خدمت کے لیے واپس بلا لیاگیا۔علامہ اقبال نے غازی علم دین شہید کے بارے میں کہا تھا''ترکھاناں دا منڈا بازی لَے گیا'' یہاں ''پٹھاناں دا منڈا'' رہ گیا تھا۔تب انھوں نے ریڈیو کان سے لگا لیا۔خبریں، ترانے ، ڈرامے، گیت کچھ بھی سننے سے نہ رہ جاتا۔یاسین واپس آیا تو اسے بلا بلا کر محفلیں جمائی جاتیں۔

سری نگر تو ان کے باپ کا وطن تھا۔''موئے مبارک'' کی تولیّت کے لیے واپس جانے کی خواہش کشمیر کی داستانیں بن بن کر ہمارے کانوں میں پگھلتی رہتی۔انھیں حسین پھولوں کی وہ انجمن نہیں بھولتی تھی جو ان کے آبائواجداد کی جنتِ گم گشتہ تھی۔کشمیر کے مناظر ان کے لیے دنیا کا بہترین نظارہ تھے۔

میرے وطن تیری جنّت میں آئیں گے اک دن

انھیں یقین کامل تھا کہ اس جنت میں کلیاں ضرور کِھلیں گی اور اسے ستم شعاروں سے چھڑا لیا جائے گا۔سری نگر میں بہت بڑا اجتماع ہو گا۔ہم سب اسی جنت میں ملیں گے۔''

جو جی جان تو بہت سی شخصیات کا ملغوبہ ہے، اس لیے اس پر بحث کرنے کی بجائے ہم دیکھتے

ہیں کہ پروفیسر عبدالحمید صدیقی کی شخصیت نگاری کچھ اس انداز سے کی گئی ہے۔ (۷)

"پنجاب پبلک لائبریری کے گوشے میں اِک مردِدرویش کا بسیرا تھا۔کتابوں کے ڈھیر میں تہذیب و ثقافت کا ایک سوتا پُھوٹتا تھا۔ سادہ سی میز کے گرد اک عظیم انسان کی مجلس آرائی تھی۔ "رفعت سلطانہ سیکشن" کے ایک گوشے میں علم و دانش کی اک شمع جلتی تھی۔کام میں منہمک اِک بے نیاز قلندر کی دنیا آباد تھی۔انسانیت کا مُسکراتا چہرہ روشن تھا۔شیریں زبانی کے حیطہ میں تاثرات کا ایک سمندر موجزن تھا۔طالبانِ علم و ادب اور عاشقانِ قرآن و ثقافت ہر وقت وہاں جمع رہتے تھے۔ صبح سے شام تک اِک نُور کی محفل جمی ہوتی تھی۔

آبِ بقائے دوام کی بات چلی ہے تو اس سے زیادہ بقائے دوام کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسلامیہ کالج کی پروفیسری، ملازمت اور روپیہ تو آنی جانی شے تھی لیکن آمر وقت کے سامنے صداقت و حریت کا خُم ٹھونکے رکھنا ہی شرفِ انسان کو ابدیت عطا کرتا ہے۔پروفیسر صاحب کو ایوب خاں نے کیا کیا دھمکیاں نہ دیں۔کیا کیا رشوتیں پیش نہ ہوئیں۔ان کے قلم ، ان کے ذہن اور ان کی گفتار کی کیا کیا قیمتیں نہ لگیں۔مگر یہ مردِ آہن اپنے نظریہ، اپنے نصب العین اور اپنے قول کا پکا رہا۔

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایمان ہے

وہ کسی قیمت پر نہ بک سکا۔اس نے اسلامیہ کالج کی ملازمت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ مگر اسلام کا دامن نہ چھوڑا اور پھر اس مردِ قلندر کی بے نیازی کا کیا کہنا۔اس کی عظمت کا اندازہ لگایئے کہ پروفیسری چھوٹی تو جماعت اسلامی کے پرچے "ترجمان القرآن" کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ معاوضہ کیا طے ہوا، ڈھائی سو روپے!دس پندرہ برس میں مہنگائی اور معاوضے کہاں جا پہنچے۔مگر اس نے امیر جماعت کے ساتھ بس ایک بار معاوضہ طے کر لیا تو پھر کبھی بڑھانے کا مطالبہ نہ کیا۔آخر دم تک پرچے کی ادارت کی اور معاوضہ وہی ڈھائی سو روپے! رسالہ بھی وہ تھا جو حکومتِ وقت کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتا رہا۔" (۸)

ڈاکٹر صابر کلوروی کی ظاہری اور داخلی شخصیت میں اختلافی نکات کچھ اس انداز سے بیان کیے ہیں:

"ایک درمیانے سے قد کا کوئی میری عمر کا ایک نوجوان میرے کمرے میں داخل ہوا۔تیکھی

ناک ، تیز آنکھیں ، دیہاتی چہرہ۔

یہ نوجوان کچھ بے قرار، جوشیلا، متحرک اور کچھ کر گزرنے والا نظر آیا۔بس ذرا سی رہنمائی کی ضرورت تھی۔مزاج میں ذرا سنجیدگی تھی۔آنکھوں سے محنت کرنے کا عزم جھلکتا تھا، لیکن ایسے جیسے کوئی چلّہ کاٹنے کی مشقت سے گزر کر بس درویش ملنگ ہو کر رہ جانا چاہتا ہو۔

نچلانہ بیٹھنے والا نوجوان ملنگ بن گیا ہے۔واقعی چند برس کا سکوت گزرا ،پھر بیسویں صدی بھی گزر گئی۔دنیا، پاکستان اور مقتدرہ ایک نئے دَور کی صدی میں داخل ہو گئے۔نئے تقاضے اُبھرے۔ڈاکٹر صابر کلوروی بھی پیچھے نہ رہا۔

جن کتابوں، رسالوں کو چاٹ چاٹ کر اس نے اپنا نام پیدا کیا تھا۔انھیں دوسروں کی تواضع کے لیے اپنے گھر میں سجا کررکھ چھوڑا تھا۔ہر طرح کے پروانے کے لیے صلائے عام تھی۔ایک سیمی نار میں تو اس نے مانسہرہ یونیورسٹی کے لیے ذخیرہ وقف کرنے کا اعلان بھی کیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس وقت اُس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کا کوئی خیال نہ کیا جائے مگر اِس یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو زبان قائم کر دیا جائے۔

مقتدرہ قومی زبان نے پشاور سیکرٹریٹ کو اُردو کا کلمہ پڑھانے کے لیے پشاور میں ذیلی دفتر قائم کیا تو ڈاکٹر صابر کلوروی نے اعزازی خدمات پیش کر دیں۔سیکرٹریٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ پشاور نے دفتری اُردو کا غلغلہ بلند کیا تو ڈاکٹر صابر کلوروی آگے آیا۔اُردو اطلاعیات کی ایک ورکشاپ منعقد کی تو وہ ہر مصروفیت چھوڑ کر چلا آیا۔وہ میرا رفیقِ فکر تھا۔میری ذہنی تگ و تاز کا ساتھی تھا۔میرے تصوریات کا دوست تھا۔مجھے یہ اعتماد تھا کہ اُردو کے شعبوں میں کوئی تو دم ساز ہے کہ مجھ سے اکیلے اب اس زبان کے مستقبل کی راہیں نہیں سنبھلتیں۔"(۹)

و قارہاشمی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اس کاخط ملا۔کون جانتاتھا کہ یہ اُس کامیرے نام آخری خط تھا۔منگل کے روز مجھے یاد بھی نہ رہا کہ اُسے آنا ہے۔سارا دن گزر گیا۔چھٹی کے وقت میں اپنا سامان سمیٹ رہا تھا کہ ایک بہت بڑا بنڈل، جسے بوری کہنا زیادہ مناسب ہو گا، اُٹھائے ہوئے، ایک دھان پان سا، متوسط عمر کو پہنچنے والا شخص میرے کمرے میں داخل ہوا۔بنڈل کو بڑی احتیاط کے ساتھ میری میز پر رکھا اور مخاطب ہوا:

’’ جی جی، آیئے‘‘میں حیرت میں گُم ہو کر اُس شخص کو دیکھ رہا تھا۔اس کی شخصیت میں کوئی دلآویزی نہیں تھی، نہ لباس میں کوئی خاص بات تھی۔ایک عام سا شخص، بس مجھے وہ ایک عام سا شخص لگا جسے میں ہر روز سڑکوں پر پھرتے، مزدوری کرتے دیکھتا ہوں۔

میں پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہوں۔ قومی زبان کی ترقی کا شوق پچھلے پندرہ بیس سال سے میرے روئیں روئیں میں بساہوا ہے۔میں نے بڑی محنت سے یہ ڈکشنریاں تیار کی ہیں۔آپ کے سُپرد ہے یہ قومی کام۔آپ اسے قوم کے سپرد کر دیں۔‘ ‘

’’اَور آپ کا فرض کیا ہے؟‘‘

’’کشمیر ہمارا ہے، مسلمانوں کا علاقہ ہے۔پاکستان کا حصہ ہے، اس وقت دشمنوں کے قبضے میں ہے۔اسے آزاد کرانا ہے۔کشمیریوں میں بیداری پیدا ہو چکی ہے، میں بھی ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۹۴۸ء میں دشمن نے فوج کے ذریعے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔چند مٹھی بھر مجاہدوں نے کچھ حصہ آزاد کرا لیا۔اگر اقوامِ متحدہ کی مداخلت سے جنگ بند نہ ہو جاتی تو کشمیر آزاد ہوتا۔اب پچاس سال گزر چکے ہیں۔ عالمی اداروں اور طاقتوں نے کچھ نہیں کیا۔کشمیر اس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتا، جب تک کہ کشمیری خود اسے آزاد کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔یہ زندگی کس کام کی جو دوسروں کے کام نہ آئی؟ میں اہلِ کشمیر کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے۔میرا فرض مجھے بُلا رہا ہے۔یہ فرض علمی کاموں سے بڑھ کر ہے۔طالب علم اور اہل علم تو بہت پیدا ہو جائیں گے، قومی زبان بھی ترقی کرے گی لیکن اگر قوم ہی نہ رہی، اگر ملک ہی نہ رہا تو علمی ترقی کے کیا معنی؟ اگر اسکا ایک حصہ مصیبت میں ہو تو سب کچھ چھوڑ کر اسے بچانا ہے۔یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں۔یہ بجا کہ میری ایک جان سے کچھ نہیں ہو گا لیکن قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے۔میں نے جہاد کے لیے اپنی والدہ سے اجازت لے لی ہے۔اب آپ سے اجازت چاہتا ہوں...‘‘(۱۰)

دیگر شخصیات میں بلوچستان کے محمد رمضان ملک کا حلیہ زیادہ توجہ کھینچتا ہے۔لکھتے ہیں:

’’اُونٹوں کے ایک بڑے کارواں کی نکیل تھامے، ایک شخص، صحرائوں میں اپنے پہلے سے طے کردہ راستے پر چلا جا رہاہے۔اس نے لمبے سفید شلوار قمیض پر ایک اور سفید چادر اوڑھ رکھی ہے۔پاؤں میں بہت بڑے بڑے جوتے ہیں اور سر پر ایک بہت ہی بڑا سفید عَمامہ ہے۔اس کا جسم توانا اور چال تیز

قدم ہے۔ چہرے پر ماہ و سال گزرنے کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ ہے وہ تصویر جو ''ساربان'' کے لفظ کے ساتھ ہمارے تصور میں پہلی بار اُبھری۔

احسان دانش کے ظاہری حلیے کے بارے میں رقم طراز ہیں:(۱۱)

'' ناٹے سے قدکی، حوادث زمانہ اوڑھے، ایک بردبار بھاری سی شخصیت ، چہرے کی سیاہ رنگت پر چیچک کے نشیب و فراز کی اوٹ سے جھلکتی ہوئی تیز اور بے قرار نگاہیں۔ ملیشیا یا کھدر کی پوشاک پہنے، سادہ سی واسکٹ اورایک ایسی ہی غالب نما ٹو پی زیب تن کیے تاحیات ایک مزدور شاعر کہلانے اور کتابوں ہی کے بیوپار میں لگے رہنے والے اُستادجو بڑے بڑے مشاعرے لوٹتے اور منشی فاضل کا کورس کرنے والوں کے ممتحن بنے رہتے۔ یہ تھے حضرت احسان دانش۔

وہ جس جفا کشی کی منزلیں طے کرتے ہوئے مقامِ تخلیق تک پہنچے وہ حیرت خیز بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ جسم و جاں کے رشتوں کو سنبھالنا اور قلم کی آب رکھنا آسان نہیں۔ یہ احسان دانش ہی کا کام تھا کہ انھوں نے بادِ مخالف کے تھپیڑوں کے سامنے اپنی قامت کو اُستوار رکھا اور پھر قائم بالذات ہو کر بڑی تنومندی اور جرأت و بے باکی سے پرورشِ لوح و قلم کی۔(۱۲)

ان کی داخلی کیفیات کے ہر پہلو کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

''بات یہ بھی نہیں کہ احسان صاحب کوئی بالکل ہی بے نیازانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ صاحبان وسائل اور ارباب بست و کشاد سے ایک حد تک مرعوب و ممنون بھی رہتے تھے۔ وہ بھی ان کے معترف ہوا کرتے۔ ایک قصیدہ انھیں شالیمار باغ کے پاس پلاٹ ، انعامات ، تمغے اور نیشنل لائبریری میں ان کی کتابوں کی فروخت بھی دلواگیا تھا۔

جہانِ دگر میں دوسروں پر ان کے تبصرے اس امر پر شاہد ہیں۔

فالج سے بحال ہونے کے بعد اگرچہ مایوسی اور ڈپریشن طبیعت کا حصہ ہوتا ہے۔ مگر میں نے احسان صاحب کو تب بھی فکر سخن میں غلطاں پایا۔ ان کا ایک نعتیہ شعر اسی تفکر سے بر آمد ہوا۔ میر ے خیال میں اُردو کے نعتیہ ذخیرے کے دامن میں اس سے قیمتی جوہر کوئی اور نہیں

دانش میں خوفِ مرگ سے مُطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سُنّت حضور کی''

ڈاکٹر نذیر احمد سانگی کے حوالے سے لکھتے ہیں:[۱۳]

اوپن یونیورسٹی کا ایسی بصیرتوں کی عظمتوں کا یہ نقیب ہے ڈاکٹر نذیر احمد سانگی۔"

اَمّاں سین کے نام سے یہ کتاب پہلے ایڈیشن میں تو صرف اسی ایک شخصیے پر مشتمل تھی، پھر جوں جوں ایڈیشن شائع ہوتے گئے، مشمولات کی تعداد بڑھتی گئی۔ حضرتِ انسان بھی الگ طور سے شائع ہوا۔ پھر ایک ایڈیشن میں دونوں خاکے یک جا ہو گئے۔ پھر جُو جی جان تخلیق ہوا اور کتاب کا نام اماں سین اور دیگر شخصیے میں بدل گیا۔ اگلے ایڈیشن میں اِک عظیم انسان اور اُردو کاملنگ شامل ہوئے۔ بات یہیں نہیں رُکی۔ اِک عظیم انسان بہت عرصہ پہلے کی ایک تحریر تھی۔ ایسی ہی دو اور تحریریں بارِ عظمت اور ساربان ملا کر ایک اور ایڈیشن وجود میں آیا۔ اس کے چوتھے ایڈیشن میں مزدورِ دانش اور بصیرتِ عظمیٰ کا نقیب کے نئے خاکے شامل ہوئے۔ گویہ سب پہلے تین خاکوں کی سطح کے تو نہیں تھے، مگر خاکہ نگاری کی تعریف پر پورے اُترتے ہیں۔ اس لیے ان کی شمولیت کا جواز موجود ہے۔[۱۴]

حوالہ جات

۱: دیکھیں:

مسرت خان زاہدی، دانائے رازِ اُردو، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

بُخاری، سید اشفاق حسین (ڈاکٹر)، عطش نامہ، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، طبع دوم، ۲۰۱۴ء

بُخاری، سید اشفاق حسین (ڈاکٹر)، مقالاتِ عطش شناسی، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، طبع دوم، ۲۰۱۶ء

بُخاری، سید اشفاق حسین (ڈاکٹر)، اَمّاں سَین: ایک مطالعہ، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

مدیحہ نقیب احمد، ہمہ جہت دانش ور، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

افشاں ملک، آثار و کارِ عطش، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

خالد محمود، پروفیسر، تقابلی عطش شناسی، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

نسرین زہرا ، (مرتب)، مصاحباتِ عطش، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء،
طبع دوم ،۲۰۱۲ئ، طبع سوم ، ۲۰۱۴ئ، طبع چہارم ، ۲۰۱۷ء

ابدحنائی، اُردو خاکہ نگاری: فن، تاریخ، تجزیہ ، اکادمی باز یافت ، کراچی، ۲۰۱۵ء

بادشاہ منیر بخاری (ڈاکٹر)، تبصرہ، اَتّاں سَین،"خیابان" ، شعبہ اُ ردو، جامعہ پشاور، نمبر ۲۲، ۲۰۱۰ء

انور سدید(ڈاکٹر) ، تبصرہ ، " اَتّاں سَین اور دیگر شخصیے"، روزنامہ "نوائے وقت "
لاہور، ۱۴ر ستمبر ۲۰۰۸ء

یاسین، رانا غلام، ڈاکٹر عطش دُرّانی کی خاکہ نگاری ،روزنامہ "نوائے وقت"، ملتان ،۲۲ر جنوری ۲۰۰۸ء

حمید قیصر، پروفیسرڈاکٹر عطش دُرّانیسے تبادلہ ء خیا ل، ماہنامہ، " اخبارِ اُردو ' ،اسلام آباد، نومبر،دسمبر ۲۰۱۴ء

عباس، محمد(ڈاکٹر)، پاکستان میں اُردو خاکہ نگاری تحقیقی و تنقیدی جائزہ : (۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۵ء)
پی ایچ ڈی مقالہ : ۲۰۰۸ء ، قرطبہ یونیورسٹی پشاور (غیر مطبوعہ)

۲ ـ عطش نامہ، طبع دوم، شاخِ زرّیں، اسلام آباد، ۲۰۱۴ئ، ص ص:۲۳۸ تا ۲۴۰، ۲۴۹ تا ۲۵۰

۳ ـ اتاں سین اور دیگر شخصیے، طبع چہارم ،شاخِ زرّیں، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء ، ص: ۴۰ و دیگر

۴ ـ ایضا، ص: ۴۷ و دیگر

۵ ـ ایضا، ص: ۶۱ و دیگر

۶ ـ ایضا، ص:۶۸ و دیگر

۷ ـ ایضا، ص:۱۱۷ و دیگر

۸ ـ ایضا، ص:۱۲۱ و دیگر

۹ ـ ایضا، ص:۱۲۸ و دیگر

۱۰ ۔ایضا، ص:۱۳۱ و دیگر

۱۱ ۔ ایضا، ص:۱۳۵ و دیگر

۱۲ ۔ایضا، ص:۱۳۷و دیگر

۱۳ ۔ایضا، ص:۱۵۰و دیگر

۱۴ ۔ دیکھیں:

بُخاری، سید اشفاق حسین (ڈاکٹر)، عطش نا مہ ، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۳ ء ، طبع دوم ، ۲۰۱۴ء